عصمت چغتائی کا افسانہ ''مغل بچّہ'' کا تجزیہ

ڈاکٹر افشاں ملک

S-4، عظیم اسٹیٹ۔2، نیو سرسید نگر، میڈیکل روڈ، علی گڑھ (یوپی)، موبائل: 9557654926

عصمت چغتائی کا شمار ترقی پسند افسانے کے ان معماروں میں کیا جاتا ہے جنھوں نے اپنی بیش بہا تخلیقات سے اردو افسانے کے ذرّیں دور کو جنم دیا۔ وہ اپنے معاصرین سعادت حسن منٹو، راجندر سنگھ بیدی، احمد ندیم قاسمی اور کرشن چندر جیسے قدآور افسانہ نگاروں کے مابین ایک منفرد شناخت رکھتی ہیں۔ افسانہ نگاری میں عصمت کا اختصاص یہ ہے کہ انھوں نے اس وقت کے قدامت پسند ہندوستانی معاشرے کے ان خانگی مسائل کو اپنی تخلیقات کا موضوع بنایا جن کو ان کے پیشرو فنکاروں نے لائق اعتنا نہیں سمجھا تھا۔ چونکہ عصمت کے اندر نسائی حسّیت کوٹ کوٹ کر بھری تھی اوپر سے نگاہ عقابی اور ذہن بھی انقلابی تھا سو انھوں نے باآسانی بھانپ لیا کہ عورت کی اس دگرگوں حالت کے پیچھے پدرسری معاشرے کے پروردہ مرد میں سرایت کر چکا ''صنفی برتری'' وہ احساس ہے جو عورت کو مساوی حیثیت اور اس کے انسانی حقوق دینے کو تیّار نہیں ہے۔ اسی لیے نہ عورت تعلیم یافتہ ہوسکی نہ معاشی طور پر مضبوط ہو پائی، نہ وراثت میں حصّہ دار ٹھہرائی گئی یہاں تک کہ اسے اپنے ذاتی فیصلے کرنے کا بھی حق حاصل نہیں ہوا۔ بے پناہ نسائی حسّیت اور قوّت مشاہدہ کی بدولت عصمت نے نہ صرف عورت کے معاشرتی مسائل کو سمجھا بلکہ اس کے اندرون میں اتر کر اس کی داخلی دنیا میں بھی نقب لگایا اور اس کی ذہنی الجھنوں، جنسی ناآسودگیوں اور نفسیاتی پیچیدگیوں تک رسائی حاصل کی اور ان موضوعات پر جرأت اور بیباکی سے لکھا۔

معاشرے کے مردوں سے عصمت کو یوں تو کوئی پرخاش نہیں تھی، لیکن وہ اس سوچ کو ضرور بدلنا چاہتی تھیں جس کے زیر اثر پدرسری معاشرہ صدیوں سے عورت کو حاشیے پر رکھتا چلا آرہا تھا۔ حالانکہ یہاں جملۂ معترضہ کے طور پر یہ بھی عرض کرتی چلوں کہ معاشرے میں عورت کی اس دگرگوں حالت کا ذمہ دار صرف مرد ہی نہیں عورت بھی تھی اور آج بھی ہے۔ مثال کے طور پر بیٹوں کو بیٹیوں پر فوقیت، تعلیم کا حصول، وراثت میں حصّہ، پسند کی شادی، خلع کا حق، بیوہ یا طلاق شدہ کی دوسری شادی جیسے مسائل کو حل کرنے میں عورت نے کسی دور میں بھی اپنی ہم جنس کی کوئی مدد نہیں کی۔ غور کریں تو یہ وہ تمام معاملات ہیں جو عورت کے حقوق کے زمرے میں آتے ہیں اور ان حقوق کو غصب کرنے میں عورتیں بھی مردوں کے شانہ بشانہ رہیں، لیکن اس کی بھی دو وجہیں ہوسکتی ہیں ایک تو یہ کہ اس کی پرورش ہی ایسے ماحول اور معاشرے میں ہوئی جہاں اس نے اپنی ماں، دادی، نانی کو اسی طرح زندگی کرتے دیکھا، دوسرے یہ کہ تعلیم کے فقدان سے عورت کا ذہن اتنا بالیدہ ہی نہ ہوسکا کہ اسے اپنے ساتھ ہونے والی تمام ناانصافیوں کا احساس ہوتا۔ وجہ کچھ بھی رہی ہو عورت کے ساتھ ظلم ہی ہوا۔

عصمت چونکہ تعلیم یافتہ تھیں اور ذہن بھی تخلیقی تھا سو عورت کے ساتھ ہونے والے جبر اور ناانصافیوں کو محسوس کیا اور اپنا عدم اطمینان اپنی تخلیقات میں ظاہر کیا۔ عورت کی جنسی پیچیدگیوں اور ناآسودگیوں کو سامنے لانے کے لیے عصمت نے جنس کو بھی ایک مسئلے کے طور پر اُٹھایا۔ ان کے اس کھلے ڈلے تخلیقی اظہار اور مزاحمتی انداز پر لعن طعن بھی ہوئی، لیکن وہ نڈر اور بیباک ہوکر لکھتی رہیں اور سچ کی پردہ پوشی نہیں کی۔ افسانہ ''لحاف'' سے عصمت پر باقاعدہ جنس نگاری کا ٹھپّہ لگ گیا۔ ایک عرصے تک ادبی ناقدین نے عصمت کی تخلیقات کو نظر انداز کیا، لیکن جب عصمت کا پہلا افسانوی مجموعہ ''کلیاں'' (مطبوعہ ۱۹۴۰) منظر عام پر آیا تب ''ادبی دنیا'' کے مدیر مولانا صلاح الدّین احمد نے افسانہ ''لحاف'' پڑھ کر یوں اظہار خیال کیا:

> ''عصمت کے فن کی غالباً سب سے نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنی بصیرت کی اک نہایت بے باک اور صداقت شعار ترجمان ہیں اور اگرچہ ان کی یہ ترجمانی ان کی نگارش کی پرکاری کا نقاب اوڑھے رہتی ہے، لیکن از بس کہ وہ ہندوستانی عورت ہیں، اس لیے اس نیم پخت دور میں انہیں اپنی جرأت کی وہ داد نہیں مل سکتی جو ان کا حق ہے۔ داد تو ایک طرف اگر وہ اس بیداد سے بچ جائیں، جس کی ارزانی میں معترضوں کے دل ان کی زبانوں کا ساتھ نہیں دیتے تو بسا

غنیمت ہے۔''

(ماخوذ: اردو افسانے کی روایت، از مرزا حامد بیگ، جلد اوّل، ص:۸۹، ایم آر پبلیکیشنز نئی دہلی)

عصمت کے اوّلین افسانوں میں ''بچپن'' اور ''کافر'' ہیں جو ۱۹۳۸ء میں ''ساقی'' میں شائع ہوئے، اس کے بعد کئی شاہکار افسانے منظر عام پر آئے جن میں بطور خاص ''چوتھی کا جوڑا''، ''ساس''، ''جڑیں''، ''اف یہ بچے''، ''ننھی کی نانی''، ''چابڑے''، ''مغل بچّہ''، ''چھوئی موئی''، ''بھول بھلیاں''، ''نیند''، ''بھیڑیں''، ''پنکچر''، ''کلّو کی ماں''، ''گیندا''، ''مقدّس فرض''، ''خدمت گار''، ''بھابی''، ''گلدان''، ''امربیل'' اور ''بچھو پھوپی'' شامل ہیں۔

افسانہ ''مغل بچّہ'' عصمت کی ایک لازوال تخلیق ہے، یہ افسانہ بھی عورت کے استحصال کی کہانی ہے بلکہ یہ کہا جائے کہ عورت پر ڈھائے گئے اس ظلم کی کہانی ہے جو بظاہر نظر نہیں آتا۔ پدر سری معاشرے میں عورت کی زندگی کے سارے فیصلے اس کا ''کفیل'' کرتا ہے۔ عورت کو بچپن سے ہی یہ تعلیم دی جاتی ہے کہ اسے اپنے ''کفیل'' کے فیصلوں پر سر جھکانا ہے، اس کی رضا میں راضی رہنا ہے۔ شادی سے پہلے باپ اور بھائی، شادی کے بعد شوہر اور بیٹے اس کی زندگی کے فیصلے کرنے کے مجاز ہیں اور ان فیصلوں میں اس کی رضامندی شامل ہونا ضروری نہیں سمجھا جاتا۔ عورت کی داخلی دنیا تو مرد کی نظر میں بالکل بے معنیٰ ہے۔ اس کے جذبات و احساسات اور جسمانی یا جنسی خواہشات کو یکسر نظر انداز کیا جاتا ہے۔ ناآسودگیوں کی شکار عورت ریزہ ریزہ وجود کو گھسیٹتی بوڑھی ہو جاتی ہے اور اپنے ان حقوق کو بھی حاصل کرنے سے قاصر رہتی ہے جو ایک انسان ہونے کے ناطے اسے حاصل ہونا چاہیے۔ کیسا المیہ ہے کہ عورت کے سارے حقوق بھی غصب کیے جاتے ہیں اور اس سے ہی اجداد کی ''عزّت'' کو بنائے رکھنے کا اقرار نامہ بھی لیا جاتا ہے.....!!!

مذکورہ افسانہ ''مغل بچّہ'' عورت کی اسی اندھیری دنیا کو سامنے لاتا ہے، اس افسانے کی کئی پرتیں ہیں۔ موضوع دلگیر اور گہرائی و گیرائی لیے ہوئے ہے۔ ذیل میں اس کا تفصیلی جائزہ پیش ہے:

پدر سری معاشرے کا پروردہ مرد ہمیشہ سے عورت کی (کسی بھی میدان میں) برتری کو تسلیم کرنے میں اپنی ہتک سمجھتا آیا ہے خواہ یہ برتری معاشی ہو، پیشے کے حوالے سے ہو، اعلیٰ تعلیم یا خوبصورتی کی ہو۔ عورت مرد کی نفسیات کا یہ تضاد کیسا عجیب ہے کہ بیوی کی خوبصورتی سے عام شکل والا مرد (شوہر) احساس کمتری میں مبتلا ہو جاتا ہے جبکہ عام شکل والی عورت خوبصورت مرد کی بیوی بن کر خود پر فخر کرتی ہے۔ عصمت کا یہ افسانہ مرد عورت کے اسی نفسیاتی پیچ وخم کو سامنے لاتا ہے۔

افسانے کا پس منظر مسلم معاشرے کا ایک مغل خاندان ہے، انگریز حکومت نے جاگیریں اور مال ومتاع چھین کر مغلوں کو قلاّش کر دیا ہے، شان وشوکت ختم ہو چکی ہے، لیکن اعلیٰ نسل ہونے کا غرور برقرار ہے۔ مغل مردوں نے انگریزوں کی دی ہوئی نوکریوں کو قبول کرنا کسر شان سمجھا اور محنت کرنے میں ہتک محسوس کی۔ جب روٹیوں کے لالے پڑے تو گھر کا سامان بیچ بیچ کر کھایا کہ پیٹ کی بھوک کسی حسب نسب یا خاندانی جاہ و جلال سے واقف نہیں ہوتی ہے اور نہ ہی کسی شان وشوکت کا زوال اس کی شدّت کو کم کرتا ہے۔ بھوک کا احساس ہر حال میں یکساں ہی ہوتا ہے۔ پیٹ کی بھوک تو مغلوں کو بھی پریشان کرتی تھی، لیکن نکمّے مرد گھروں میں پڑے جھوٹی شان وشوکت کا ڈھول پیٹتے رہتے، واہیات کھیلوں میں وقت گزارتے اور گھر کا بچا کھچا اثاثہ بیچ کر زندگی کے دن کاٹتے۔ عورتیں گھر میں بیٹھ کر محنت مزدوری کر کے چولہا جلانے کے جتن کرتیں۔ افسانہ اس منظر کو یوں پیش کرتا ہے:

> ''ہمارے ابّا کے چچا روپیہ پیسہ کی جگہ چچی کے جہیز کے پلنگ کے پایوں سے چاندی کا پترا کھیڑ لے جاتے تھے۔ زیور اور برتنوں کے بعد ٹکے جوڑے نوچ نوچ کر کھاتے۔ پاندان کی گلیہاں سل بٹّے سے کچل کر ٹکڑا ٹکڑا بیچیں اور کھائیں۔ گھر کے مرد دن بھر پلنگ کی ادوائین توڑتے۔ شام کو پرانی گھسی اچکن پہنی اور شطرنج پچیسی کھیلنے نکل گئے۔ گھر کی بیویاں چھپ کر سلائی کر لیتیں۔ چار پیسوں سے چولہا جل جاتا، محلّے کے بچوں کو قرآن پڑھا دیتیں تو کچھ نذرانہ مل جاتا۔''

مذکورہ اقتباس میں عصمت نے مغلوں کے زوال کو عام بول چال کے الفاظ میں اس فنکاری سے استعمال کیا ہے کہ افسانے میں شدّت تاثر سوا ہو گیا ہے۔ زبان و بیان کا یہ مخصوص انداز ہی عصمت کو ان کے معاصرین میں انفرادی حیثیت عطا کرتا ہے۔

افسانے میں دو کردار ''گوری دادی'' اور ''کالے میاں'' مرکزی حیثیت میں ہیں۔ گوری بی جتنی خوبصورت ہیں کالے میاں اتنے ہی کالے اور معمولی شکل کے، لیکن خاندانوں میں رشتہ کرتے وقت رنگ روپ نہیں دیکھا جاتا۔ کالے میاں اور گوری بی کا رشتہ دونوں کے بڑوں نے طے کیا تھا۔ منگنی کے وقت مذاق میں اُچھالا گیا جملہ ''گوری دلہن کا کالا دولہا'' کالے میاں کے دل پر لگا۔ ماں باپ کا طے کیا ہوا رشتہ توڑنے کی ہمّت نہ تھی سو انکار نہ کر سکے اور گوری بی کو بیاہنے چلے گئے،

لیکن شادی کی محفل میں آرسی مصحف کے وقت پھر کسی نے چٹکی لے لی....''خبردار جو دلہن کو ہاتھ لگایا کالی ہو جائے گی'' کالے میاں کے سر سے لگی تو تلوؤں بجھی، محفل سے اٹھ کر بھاگ گئے اور یوں پھنکارے:

''بخدا میں اس کا غرور چکنا چور کر دوں گا۔ کسی ایسے ویسے سے نہیں مغل بچّے سے واسطہ پڑا ہے۔''

دراصل کالے میاں گوری بی کی خوبصورتی سے احساس کمتری میں مبتلا ہو گئے تھے اور کمتری کا یہ احساس غصّے کی شکل اختیار کر گیا۔ انھوں نے تہیّہ کر لیا کہ گوری بی کے حسن کے سامنے گھٹنے نہیں ٹیکیں گے یہ سوچے بغیر کہ اس میں بھلا گوری بی کا کیا قصور....؟ یوں بھی بارہ سال کی کمسن بچی کو اپنی خوبصورتی کا ایسا احساس بھی نہ ہوگا، لیکن کالے میاں کا غصّہ معصوم گوری بی پر ہی اُترا....! افسانے کا اقتباس سہاگ رات میں کالے میاں کے غصّے کو اس طرح بیان کرتا ہے:

''کالے میاں شہتیر کی طرح پوری مسہری پر دراز تھے، دلہن ایک کونے میں گٹھری بنی کانپ رہی تھی۔ بارہ برس کی بچی کی بساط ہی کیا؟

''گھونگھٹ اُٹھاؤ۔'' کالے میاں ڈکرائے۔

دلہن اور گڑی مڑی ہو گئی

''ہم کہتے ہیں گھونگھٹ اُٹھاؤ۔'' کہنی کے بل اٹھ کر بولے۔ سہیلیوں نے تو کہا تھا دولہا

ہاتھ جوڑے گا، پیر پڑے گا پر خبردار گھونگھٹ کو ہاتھ لگانے دیا۔ دلہن جتنی زیادہ مدافعت کرے

اتنی ہی پاکباز۔''

''دیکھو جی تم نواب زادی ہوگی اپنے گھر کی ہماری تو پیر کی جوتی ہو۔ گھونگھٹ اٹھاؤ ہم تمھارے باپ کے نوکر نہیں۔''

دلہن پر جیسے فالج گر گیا۔

کالے میاں چیتے کی طرح لپک کر اٹھے جوتیاں اٹھا کر بغل میں دابیں اور کھڑکی سے پائیں باغ میں کود گئے۔ صبح کی گاڑی سے وہ جو دھپور دندناتے گئے۔''

آنکھوں میں انگنت خواب سجائے کمسن گوری بی تو جیسے عرش سے فرش پر گر پڑیں۔ کالے میاں نے انہیں پیر کی جوتی کہہ کر ذلیل کیا اور گھر سے بھاگ کر ان کو ہی سوالوں کے گھیرے میں کھڑا کر گئے۔ مرد کے ہاتھوں عورت کی اسی بے توقیری اور بے عزّتی سے عصمت نالاں تھیں۔ عورت کے تئیں مرد کے ایسے سفّاک رویّوں سے انہیں نفرت تھی۔ خطا کسی کی بھی ہو مجرم عورت ہی ٹھہرائی جائے اور نا کردہ گناہوں کی سزا بھگتنا بھی اس کا ہی مقدّر ٹھہرے....!!!

احساس کمتری زخم بن گیا، کالے میاں گھر سے ایسے بھاگے کہ سات سال تک واپس نہ لوٹے۔ سہاگ رات کی کمسن دلہن انتظار کی سولی پر لٹک گئی۔ کالے میاں مرد تھے سو گھر سے باہر اپنے جسم کی بھوک مٹانا ان کے لیے مشکل نہ تھا۔ گوری بی 'اُن کے لیے'' سجتی سنورتی رہیں اور کالے میاں نے دوسرے راستے تلاش کر لیے لیکن کالے میاں کو گوری بی کی حکم عدولی اور گھونگھٹ نہ اُٹھنے کا درد بھلائے نہ بھولتا تھا۔ افسانے کا اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

''عورت کالے میاں کی سب سے بڑی کمزوری تھی۔ سارے حواس اسی ایک نکتے پر مرکوز تھے، مگر ان کی قسم ایک میخ دار آہنی گولے کی طرح ان کے حلق میں پھنسی ہوئی تھی، ان کے تخیّل نے سات سال آنکھ مچولی کھیلی تھی۔ انھوں نے بیسیوں گھونگھٹ نوچ ڈالے رنڈی بازی، لونڈے بازی، بٹیر بازی، کبوتر بازی غرض کوئی بازی نہ چھوڑی، مگر گوری بی کے گھونگھٹ کی چوٹ دل میں پنجے گاڑے رہی۔ جو سات سال سہلانے کے بعد زخم بن چکی تھی۔''

سات سال کے بعد کالے میاں کی گھر واپسی کی وجہ اب بھی گوری بی نہ تھیں۔ کسی سے خبر ملی کہ باپ کا چل چلاؤ ہے تو چلے آئے۔ بیٹے کو دیکھ کر باپ نے موت کے فرشتے سے مہلت مانگ لی کہ بیٹے کا الجھا معاملہ سلجھا دیں، خاندان کے لوگ اکٹھّے ہوئے اور متفقہ رائے سے گوری بی کو پھر سے دلہن بنایا گیا۔ امّاں نے گوری بی کو نصیحت کی کہ اگر اب کالے میاں گھونگھٹ اٹھانے کو کہیں تو ضد نہ کرنا۔ افسانے کا اقتباس امّاں کی نصیحت کو یوں سامنے لاتا ہے:

''تم اس کی منکوحہ ہو بیٹی جان۔ گھونگھٹ اٹھانے میں کوئی عیب نہیں اس کی ضد پوری کر دو۔ مغل بچہ کی آن رہ جائے گی۔ تمہاری دنیا سنور جائے گی، گودی میں پھول برسیں گے۔ اللہ رسول کا حکم پورا ہوگا....''

ہمارے معاشرے میں ازدواجی زندگیوں میں خدا رسول کا حکم صرف عورت کو ہی کیوں باور کرایا جاتا ہے....؟ اگر ''مغل'' مرد آن والا ہے تو ''مغلانی'' کی آن کی کیا اس لیے کوئی اہمیت نہیں کہ وہ عورت ہے....؟ ضد کرنے کا حق صرف ''مرد'' کو حاصل ہے اور ضد پوری کرنے کے لیے مجبور ''عورت'' کو کیا جاتا ہے....!!! سماج میں مرد کی برتری کے حوالے سے رائج ایسے رویّوں اور اصولوں سے عصمت کو سخت اختلاف تھا۔ ان کی نگاہ میں شوہر بیوی برابر کی حیثیت رکھنے والے وہ افراد ہوتے ہیں جو مل کر ایک خوشحال خاندان کی تشکیل و تعمیر

کرتے ہیں اور ایک صحت مند معاشرہ وجود میں آتا ہے۔اس اقتباس میں عصمت چغتائی نے مرد معاشرے میں پلی بڑھی ماؤں اور دادیوں، نانیوں کی اس نفسیات پر بھی روشنی ڈالی ہے جس میں وہ مرد کی حاکمیت کے درجے کو بخوشی قبول کر کے اس کی محکوم بننے میں فخر محسوس کرتی آئی ہیں اور یہی احساس سینہ بہ سینہ اپنی نسلوں (بیٹیوں) میں منتقل کر رہی ہیں۔عصمت عورت کی اس ذہنیت کو بدلنا چاہتی تھیں۔ان کا مقصود تھا کہ عورت کو اپنی صنف کی وجہ سے کم مائیگی اور مرد کو اپنی صنف کی وجہ سے برتری کا احساس کیوں ہو؟؟؟ عورت کو بھی خود اعتمادی سے زندگی بسر کرنے کا حق ملنا چاہیے....!!!

افسانہ آگے بڑھتا ہے....سات سال بعد دلہن بنی گوری بی گھونگھٹ نکالے ایک بار پھر اسی جگہ اسی کمرے میں بیٹھی ہوئی ہیں۔کالے میاں پہلے ہی کی طرح ان کے سامنے دراز ہیں لیکن اس بار بھی انھوں نے گھونگھٹ اُٹھانے میں کوئی پیش رفت نہ کی شاید کر بھی دیتے، لیکن گوری بیگم کے آگے نہ جھکنے کی ''قسم'' پھر یاد آ گئی۔دھیان آیا کہ عورت تو ''پیر کی جوتی'' ہے مرد سے کمتر ہے اور وہ خود ''مغلوں'' کے جانشین ہیں اور ''مرد'' ہیں۔عورت کو حکم دینا انہیں زیب دیتا ہے اس کے سامنے جھکنا ان کے خیال میں مرد کی شان میں بٹّہ لگنا ہے۔رعونت سے دھمکی بھرے لہجے میں پھر وہی حکم صادر کیا جو (سات سال پہلے) شادی کی پہلی رات کو کیا تھا:

''گھونگھٹ اٹھاؤ'' کالے میاں نے بڑی لجاجت سے کہنا چاہا مگر مغلئی دبدبہ غالب آ گیا گوری بیگم غرور سے تمتمائی سنّاٹے میں بیٹھی رہیں۔''آخری بار حکم دیتا ہوں۔گھونگھٹ اٹھا دو ورنہ اسی طرح پڑی سڑ جاؤ گی، اب جو گیا، پھر نہ آؤں گا....''

''اس بار انہیں یقین تھا کہ ان کی قسم پوری ہوگی۔گوری بی ایسی عقل کی کوری نہیں کہ جینے کا یہ آخری موقع بھی گنوا دیں، دو انگلیوں سے ہلکا پھلکا آنچل ہی تو سرکانا ہے کوئی پہاڑ تو نہیں ڈھونے۔''

گوری بی اب انّیس سال کی جوان دوشیزہ تھیں کوئی بچّی نہ تھیں جو کالے میاں کی حکم بھری دہاڑ سن کر سہم جاتیں اور اپنے ہاتھوں گھونگھٹ اُلٹ کر خود کو ''سڑنے'' سے بچا لیتیں۔کالے میاں کی رعونت ان کو بھی چراغ پا کر گئی اور ان کے ہاتھ گھونگھٹ اُٹھانے کے لیے نہ اُٹھے۔کالے میاں کی قسم پوری نہ ہوئی اور غصّے سے تمتمائے ایک بار پھر وہ کمرے کی پچھلی کھڑکی سے کود کر بھاگ گئے اور ایسے گئے کہ برسوں کوئی سراغ نہ ملا۔مسلسل ہجر کو گوری بی کا مقدّر بنا کر خود بھی نہ جانے کہاں کہاں کی خاک چھانتے پھرے پر گھر نہ لوٹے۔گوری بی پر ایک اُفتاد اور پڑی کہ ماں کے سائے سے بھی محروم ہو گئیں۔حویلی پر خزاں موسموں نے ڈیرے ڈال لیے۔دل بھی خالی ہاتھ بھی خالی۔معاشی تنگ دستی میں اپنے زیور بیچ بیچ کر گوری بی نے وقت کاٹا پھر بھی کالے میاں کے لیے پابندی سے سجنا سنورنا نہ بھولیں۔افسانے کا اقتباس گوری بی کی اس کیفیت کو یوں بیان کرتا ہے:

''جب تک ماں زندہ رہیں گوری بی کو سنبھالے رہیں ان کے بعد یہ ڈیوٹی خود گوری بی نے سنبھال لی۔ہر جمعرات کو مہندی پیس کر پابندی سے لگاتیں دوپٹّہ رنگ چُن کر ٹانکتیں اور جب تک سسرال زندہ رہی تہوار پر سلام کرنے جاتی رہیں۔''

اکیلے گھر میں گوری بی نے تنہائیوں سے سمجھوتا کر لیا، وقت کے ساتھ جس طرح حویلی منہدم ہوتی جا رہی تھی اسی طرح گوری بی کا وجود بھی پگھل رہا تھا، جوانی کب کی رخصت ہو چکی تھی۔گوری بی کے حوالے سے عجیب عجیب قصّے مشہور ہو گئے تھے۔لوگ کہتے تھے کہ گوری بی پر جن عاشق ہیں جو کالے میاں کو ان کے پاس پھٹکنے نہیں دیتے۔افسانے کا متن کہتا ہے:

''گوری بی کولہو کے اندھے بیل کی طرح زندگی کے چھکڑے میں جُتی اپنے محور پر گھومی جا رہی تھیں۔ان کی کرنجی آنکھوں میں تنہائیوں نے ڈیرہ ڈال دیا تھا۔''

عصمت افسانے کی کردار گوری بی کے حوالے سے ایک عورت کی جسمانی ضرورت اور جنسی خواہشوں کی ناآسودگیوں کو بڑی دردمندی سے بیان کرتی ہیں:

''گوری بی نے ساری عمر کیسے کیسے ناگ کھلائے ہوں گے۔کیسے اکیلی نامراد زندگی کا بوجھ ڈھویا ہوگا۔ان کے رسیلے ہونٹوں کو کبھی کسی نے نہیں چوما۔انھوں نے جسم کی پکار کو کیا جواب دیا ہوگا؟''

ایک عورت (بیوی) کا ایسے مرد (شوہر) کا ساری عمر انتظار کرنا جس نے نہ اس کی آنکھوں میں اُترے خوابوں کو تعبیریں عطا کیں اور نہ پیاسے وجود کو سیراب کیا۔مرد کے ایسے ظالم اور جابر رویّے مشرقی سماج یا مرد معاشرے میں لائق تحسین ہو سکتے ہیں، لیکن مذہب اور انسانیت کی شریعت میں یہ ظلم ہے اور گناہ کے زمرے میں آتا ہے....!!!

عورت کے اندرون کی اس گھٹن کو عصمت سے پہلے کب کسی ادیب یا ادیبہ نے یوں محسوس کیا تھا؟ ہمارے معاشرے میں عورت کے جذبات اور احساسات کی ان دیکھی آج بھی کوئی اچنبھے کی بات نہیں ہے۔عمر رسیدہ غیر شادی شدہ لڑکیوں کے دکھ کا اندازہ کرنا آسان نہیں،

کمسن بیوہ ہو یا جوان طلاق شدہ عورت، معاشرہ یا خاندان ان کی دوسری شادی کی فکر نہیں کرتا۔ایک سے زیادہ شادیاں کرنے والے مردوں کی پہلی بیویاں بھی اسی طرح نظر انداز ہوتی ہیں اور شوہر کے صرف ''نام'' پر زندگی کے دن گزار دیتی ہیں۔ اپنے جذبات و احساسات کو مار کر زندہ رہنے کی کوشش میں کئی بار عورتیں دماغی اختلال کا شکار ہو جاتی ہیں یا کئی بار جذبات کے ہاتھوں مجبور ہو کر غلط قدم بھی اُٹھا لیتی ہیں۔

افسانے کا اختتام بھی چونکانے والا ہے۔ پورے چالیس برس بعد کالے میاں اپنے سڑے گلے بیمار وجود کو گھسیٹتے خود ہی واپس آ گئے۔ شاید اس ظلم پر نادم تھے کہ اپنی معصوم بیوی کو برسوں تڑپایا تھا، انتظار کی سولی پر لٹکا کر اس کے جذبات و احساسات کا خون کیا تھا، اسے تنہائی کے ناگوں سے ڈسوایا تھا۔اب شاید پچھتاؤں کی آگ ان کو جلائے دے رہی تھی، سو گھر میں کہلوایا ''گوری بی سے کہو مشکل آسان کر جائیں۔'' برسوں سے کالے میاں کی آمد کی منتظر گوری بی سب کچھ بھول بھال کر میاں کے پاس جانے کے لیے فوراً تیار ہو گئیں۔ایک مشرقی عورت نے شوہر کے ہاتھوں اتنا رُل کر بھی وفا کی خو نہ چھوڑی، اختتامیہ اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

''ایک کم ساٹھ کی دلہن نے روٹھے ہوئے دولہا میاں کو منانے کی تیاریاں شروع کر دیں مہندی گھول کر ہاتھ پیروں میں رچائی۔ پانی سمو کر پنڈا پاک کیا۔سہاگ کا چکٹا ہوا تیل سفید لٹوں میں بسایا۔صندوق کھول کر بور بور ٹپکتا جھڑتا بری کا جوڑا نکال کر پہنا اور ادھر کالے میاں دم توڑتے رہے.....

جب گوری بی شرماتی لجاتی دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی ان کے سرہانے پہنچیں تو جھلنگے پر چیکٹ تکیے اور گودڑ بستر پر پڑے ہوئے کالے میاں کی مٹھی بھر ہڈّیوں میں زندگی کی لہر دوڑ گئی، موت کے فرشتے سے الجھتے ہوئے کالے میاں نے حکم دیا....

''گوری بی گھونگھٹ اُٹھاؤ''

گوری بی کے ہاتھ اُٹھے، مگر گھونگھٹ تک پہنچنے سے پہلے گر گئے۔

کالے میاں دم توڑ چکے تھے۔

وہ بڑے سکون سے اکڑوں بیٹھ گئیں، سہاگ کی چوڑیاں ٹھنڈی کیں اور رنڈاپے کا سفید آنچل ماتھے پر کھینچ لیا۔''

افسانہ دلگیر انجام کے ساتھ ہی قاری کے دل میں ایک ملال سا اُتار دیتا ہے۔

یہ افسانہ سماجی نفسیات کو بھی سامنے لاتا ہے، کئی بار ذاتی زندگی کے فیصلوں میں معاشرے کی سوچ اور دخل اندازی انسان کو اس حد تک زیر کر لیتی ہے کہ پھر وہ آزادانہ اپنے ذاتی فیصلے کرنے کی قوّت سے بھی محروم ہو جاتا ہے۔اس افسانے کے ہیرو کالے میاں کا بھی یہی مسئلہ تھا۔ دراصل کوئی بھی مرد انفرادی طور پر عورت کے تئیں اتنا کٹھور نہیں ہو سکتا شاید کالے میاں بھی نہیں تھے، لیکن ان کا دل جب جب گوری بی کی طرف لپکتا وہ جملے ان کے اندر زہر بھر دیتے جو شادی کے وقت گوری بی کی خوبصورتی اور ان کے کالے رنگ کو لے کر مذاقاً کہے گئے تھے۔ یہ مذاق کالے میاں کے دل میں ناسور بن گیا، حالانکہ گوری بی تو اس مذاق میں شامل بھی نہ تھیں۔انھوں نے تو اپنی حسین آنکھوں میں کالے میاں کے دل پر ہی راج کرنے کے خواب سجائے تھے، لیکن ہر بار کالے میاں کا احساس کمتری گوری بی کی قربت میں آڑے آیا۔ادھر گوری بی نے ناکردہ گناہوں کی ایسی سزا پائی کہ ساری زندگی کالے میاں کے نام پر سہاگن کہلائیں، لیکن وصال کی مٹھی بھر ساعتیں بھی میسّر نہ ہوئیں۔ایک مرد نے اپنی زخمی انا کا بدلہ اس عورت سے لیا جو قصوروار بھی نہ تھی۔گوری بی نے بڑی وفاداری اور عقیدت سے بچپن سے بڑھاپے تک کا سفر ایک مرد کی ''بے وفائی'' کے سہارے طے کیا....!

جہاں تک ازدواجی رشتوں کا تعلق ہے یہ رشتہ انا یا غرور سے نہیں پنپتا، اسے محبت ہی نمو پہنچاتی ہے اور یہ تب ہی ممکن ہے جب مرد عورت کا حاکم نہ بنے اس سے محبّت کرے، مساوی حیثیت میں قبول کرے، اس کی عزت نفس کو چوٹ نہ پہنچائے۔مذکورہ افسانے میں جہاں مرد کی انانیت اور غرور عورت پر ظلم کی وجہ بنا وہیں ''سماجی نفسیات'' کا یہ پہلو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ کئی بار سماج کے سامنے شرمندہ ہونے، یا ''لوگ کیا کہیں گے'' کے خوف کی وجہ سے بھی ہم اپنے دل کی آواز پر کان نہیں دھرتے اور دوسرے فریق کے ساتھ ہی اپنے جذبات واحساسات کا بھی خون کر دیتے ہیں....!!!

آج عورت زندگی کے ہر میدان میں مرد کے ہم قدم ہے، پر اعتماد ہے، تعلیمی میدان میں بھی مردوں سے پیچھے نہیں ہے، خود کفیل بھی ہے اور اس کے اندر اب ظلم کے خلاف آواز اُٹھانے کی بھی ہمّت پیدا ہو گئی ہے، لیکن یہ سب تبھی ممکن ہو سکا ہے جب مرد معاشرے کی سوچ بدلی ہے اور یہ سوچ بدلنا ہی عصمت کا عین مقصد تھا۔اتنی شدّت اور جارحانہ پن سے اگر عصمت قلم نہ اُٹھاتیں تو شاید صورت حال یوں نہ بدلتی.....!!!

○○